یہ حکومتیں اپنی مستحکم پوزیشن سے عنقریب عوامی دباؤ سے کمزور ہوں گی، اور انھیں کوئی سہارا نہیں دے سکے گا۔

جہاد کی موجود شکلوں میں ایک شکل وہ ہے جو بین الاقوامی افواج کے خلاف جاری ہے اور جسے 'صیہونیت اور یہودیت کے خلاف عالمی جہاد' کا نام دیا جاتا ہے، جو اسامہ اور ایمن کی قیادت میں کیا گیا اور جس نے القاعدہ جیسے متشدد گروپوں کو جنم دے کر عرب و غرب میں ایک لامتناہی سلسلہ شروع کیا۔ اس نے حملوں کی منصوبہ بندی کی اور عوامی مقامات جیسے سفارت خانے، ریسٹورنٹ، کالونیوں اور ٹرینوں کو نشانہ بنایا اور ورلڈ ٹریڈ سینٹر کو اُڑا ڈالا۔

اسی طرح کا ایک طریقہ بڑی ریاستوں میں سیاسی تبدیلی ہے کہ جس سے بین الاقوامی پالیسیوں، منصوبوں، افکار و خیالات غرض جملہ اقدار میں تبدیلی واقع ہوتی ہے۔ اس طرح کے واقعات کے مقاصد یہ ہوتے ہیں:

۱- امریکی منصوبوں کی بالادستی، جن کی تنفیذ میں کوئی رکاوٹ نہ بن سکے۔

۲- امریکا کے ہاتھوں چند مسلم ریاستوں کا خاتمہ، اور دوسری ریاستوں کو دھمکی کہ اگر وہ 'نہ سنبھلے' تو ان کا بھی وہی حشر ہوگا جیسا کہ عراق کا ہوا۔

۳- اسلام کے خلاف امریکی اور یورپی دباؤ، فکری ہدف سازی اور معاون ممالک میں اضافہ۔

۴- پوری دنیا میں بالخصوص مغرب میں فلسطین، چیچنیا، کشمیر، فلپائن اور ترکستان جیسی مسلم اقلیات کا محاصرہ، مزاحمتی گروپوں کو 'دہشت گرد' قرار دینا۔

۵- ایک اچھوتے انداز میں پورے عالم میں امریکا کی بالادستی قائم کرنا۔

۶- ہر ملک پر امریکی تسلط اور دہشت گردی کے خلاف اسلامی گروپوں کی سرکوبی کی خاطر 'سلامتی کے لیے تعاون' کا مطالبہ کرنا تاکہ دنیا میں غلبہ مستحکم ہو سکے۔

۷- سب سے اہم یہ ہے کہ مذہبی عدم برداشت والی طاقتوں کا روز بروز بڑھتا ہوا اثر و رسوخ، بڑی بڑی ریاستوں کے فیصلہ کُن ایوانوں میں دائیں بازو کے ان مسیحی گروپوں کا تسلط۔ امریکا کے حالیہ انتخابات ان گروپوں کے غیر معمولی اثرات کا واضح ثبوت ہیں۔

۸- قومی اور بین الاقوامی قانون کے ذریعے اسلحہ خانوں کا اجرا اور ان کے بل بوتے پر

بنیادی انسانی حقوق، آزادی اور مفاد عامہ کو ہڑپ کرنا۔

۹- ہر دشمنِ اسلام کو اسلام اور اہل اسلام کے خلاف بھرپور مواقع کی فراہمی کہ وہ ان پر تشدد کریں، اسلام کی تصویر مسخ کریں، اس سے وابستہ ہر فرد و جماعت پر دہشت گردی کا الزام تھوپیں، حالاں کہ دین اسلام کی اصل یہ ہے کہ وہ دین رحمت، دین عدل وقسط اور احسان کا مذہب ہے۔

یہ سب کچھ آج دنیا میں جاری ہے۔ جو سراسر مذہبی عدم رواداری، اصول دین کے خلاف اور تباہ کن سوچ کی غمازی کرتا ہے۔ حقیقت یہ ہے کہ جہاد کسی بھی صورت میں انسان پر بزور مسلط کرنے کی چیز نہیں ہے۔ ایسا کرنا اس مشیت الٰہیہ کے خلاف ہے جو ہمیشہ سے خلق میں جاری وساری ہے۔ ارشاد باری تعالیٰ ہے: ''اگر تمھارا رب چاہتا تو سب کو ایک ہی امت بنا دیتا۔ وہ برابر مختلف طریقوں پر چلتے رہیں گے، اِلّا یہ کہ کسی پر اللہ ہی رحم فرمادے، اسی (آزادی انتخاب وامتحان) کی خاطر انھیں اس نے پیدا کیا ہے''۔ (ھود ۱۱:۱۱۸)

اس سے معلوم ہوا کہ اختلاف وتنوع سنت الٰہی ہے، جو قیامت تک جاری رہے گی اور جہاد کا مقصد ظلم وعدوان کا خاتمہ ہے۔ اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے: ''اور اللہ کے راستے میں ان لوگوں سے جہاد کرو جنھوں نے تم سے جنگ کی ہے اور زیادتی نہ کرو۔ یقیناً اللہ زیادتی کرنے والوں کو محبوب نہیں رکھتا''۔ اسلام اندھا دھند قتال کی اجازت نہیں دیتا، بلکہ صرف حملہ آوروں سے لڑنے کی اجازت دیتا ہے۔ اس سلسلہ میں نبی رحمتؐ کے ارشادات اور صحابہ کرامؓ کے اقوال بالکل واضح ہیں۔

ہر مذہب میں اپنے مخالف سے جنگ کی تعلیم موجود ہے۔ اسلام اور مسلمانوں کے خلاف پوری عالمی برادری کا اتحاد درست بات نہیں ہے۔ یہ سراسر حماقت اور ہر اعتبار سے غلط ہے۔ ان لوگوں کا خون کسی صورت مباح نہیں ہے، جو اپنے گھروں میں محفوظ و مامون ہیں، خواہ وہ عورتیں ہوں، بچے ہوں یا عام لوگ۔ ہم ان سے قتال کو کسی صورت جائز نہیں سمجھتے۔

حقیقت میں حق ہی اس بات کا سزاوار ہے کہ اس کی پیروی کی جائے اور ظلم وجور سے کمزور انسانی طبقات کو نجات دلائی جائے، اور ہر وہ انسانی معاشرہ جس میں اسلام موجود ہے، آزادی کا مستحق اور حق دار ہے۔ (المجتمع، ۳ نومبر ۲۰۱۶ء)

سقوطِ ڈھاکا: چند حقائق اور دو قومی نظریہ

ڈاکٹر صفدر محمود°

یہ سوال اکثر اُٹھایا جاتا ہے کہ: 'مشرقی پاکستان کی علیحدگی کے سانحے کا 'ڈائریکٹر' کون تھا؟' 'مشرقی پاکستان کی علیحدگی کس کی سرپرستی، مدد اور مداخلت سے عمل میں آئی؟' اس کا ہرگز مطلب اپنی سیاسی غلطیوں، کوتاہیوں، مختلف حکومتوں، حکمرانوں اور فوجی راج کے پیدا کردہ احساسِ محرومی پر پردہ ڈالنا نہیں، کیوں کہ ان سب تلخ حقیقتوں کو بھی تسلیم کرنا پڑے گا۔

یہیں پر دوسرا سوال یہ پیدا ہوتا ہے کہ: کیا اس قسم کی محرومیاں، کوتاہیاں، غیر دانش مندانہ پالیسیاں اور بے انصافیاں صرف پاکستان میں ہی روا رکھی گئیں؟ کیا صوبائی کش مکش، علاقائی خودمختاری کی تحریکیں اور لسانی عصبیتیں صرف پاکستان کی سیاست کا ہی حصّہ تھیں؟ نہیں، ہرگز نہیں۔ اس نوعیت کی صورت حال بہت سے نوآزاد یا ترقی پذیر ممالک کے علاوہ بعض ترقی یافتہ ممالک میں بھی موجود ہے۔ وہاں بھی وفاقی یا مرکزی حکومت پر بے انصافی کے الزامات لگتے رہتے ہیں، بہت سے نوآزاد ممالک کے صوبوں میں رسّہ کشی اور نفرت بھی رنگ دکھاتی ہے، بعض اوقات حکمران اور حکومتیں غلط فیصلے بھی کر گزرتی ہیں، لیکن ان تمام عوامل کے باوجود وہ ممالک اندرونی طور پر مختلف رائے رکھنے اور گاہے متصادم ہونے کے باوجود ٹوٹتے نہیں۔

بلاشبہہ ان کے کچھ علاقے یا صوبے آزادی کا نعرہ بھی لگاتے ہیں، علیحدگی کا مطالبہ بھی کرتے ہیں جیسا کہ خود آج کے بھارت میں لگ بھگ تین درجن علیحدگی کی تحریکیں جاری ہیں، اور کئی صوبوں میں علیحدگی پسندی اور آزادی کی تحریکوں کے ساتھ ساتھ گوریلا جنگ بھی ہو رہی ہے۔

° سابق وفاقی سیکرٹری، پاکستانیات پر درجن سے زیادہ کتب کے مصنف

بھارت نے جہاں ان تحریکوں کو کچل کر رکھ دیا (وہیں عالمی سطح پر تسلیم شدہ اور جائز طور پر حقِ خود ارادیت کا مطالبہ کرنے والے مقبوضہ کشمیر کے نہتے اور مظلوم کشمیریوں پر مظالم کے پہاڑ توڑے جا رہے ہیں) ـــــ پھر پاکستان ہی کو کیوں اس قیامت صغریٰ سے گزرنا پڑا؟

یہ بات تسلیم ہے کہ مشرقی پاکستان کے ساتھ وفاقی سطح پر بھی کچھ بے انصافیاں ہوئیں۔ مشرقی پاکستان آبادی میں ۵۶ فی صد تھا۔ اس لیے بظاہر جمہوری اصولوں کی روشنی میں 'آئینی برابری' (Parity) بھی اس کے ساتھ زیادتی ہی تصور کی جاتی ہے۔ یہ الگ بات ہے کہ ہمارے وہ دانش ور جو ۱۹۵۶ء اور پھر ۱۹۶۲ء کے دساتیر اسلامی جمہوریہ پاکستان میں 'آئینی برابری' کے اصول پر احتجاج کرتے ہیں اور اسے ہمالہ جیسی غلطی قرار دیتے ہیں، وہ جذبات کی رو میں بہہ کر یہ بھول جاتے ہیں کہ جغرافیائی فاصلے کو حقیقت تسلیم کرتے ہوئے برابری یا پیرٹی کا یہ اصول سب سے پہلے پاکستان کے تیسرے وزیراعظم [۱۷/اپریل ۱۹۵۳ء- ۱۲/اگست ۱۹۵۵ء] بنگالی نژاد محمد علی بوگرہ کے آئینی فارمولے [۷/اکتوبر ۱۹۵۳ء] میں آیا تھا۔[1] جس کی بنیاد پر ۱۹۵۴ء میں دستور بنایا جا رہا تھا، لیکن گورنر جنرل [اکتوبر ۱۹۵۱ء- اگست ۱۹۵۵ء] ملک غلام محمد نے پہلی دستور ساز اسمبلی برخاست [۲۴/اکتوبر ۱۹۵۴ء] کر کے دستور سازی کی بساط ہی لپیٹ دی۔ اس سے قبل بنگالی نژاد خواجہ ناظم الدین کے دستوری فارمولے میں بھی برابری کا مقصد ایک اور طریقے سے حاصل کیا گیا تھا۔ مطلب یہ ہے کہ دستورِ پاکستان میں برابری کا اصول بنگالی سیاست دانوں نے خوش دلی سے تسلیم کیا تھا۔ تاہم، ہمارے ہاں المیہ یہ ہے کہ ۱۶ دسمبر ۱۹۷۱ء کے حوالے سے ٹیلی ویژن پروگراموں میں ۱۹۵۶ء کے آئین میں طے کردہ پیرٹی کے اصول کو خوب رگیدا جاتا ہے۔ ایسا رویہ اختیار کرنے والوں کو غالباً علم نہیں کہ ۱۹۵۶ء کے آئین کی تشکیل میں جناب حسین شہید سہروردی کا تعاون ایک کارنامے کی حیثیت رکھتا ہے۔ وہ نہ صرف بنگالی تھے بلکہ شیخ مجیب الرحمٰن کے استاد، سیاسی گرو بھی تھے۔

۱- اس فارمولے کے تحت پاکستان کے ارکانِ پارلیمنٹ کی کُل تعداد ۳۰۰ مقرر کی گئی، جن میں مشرقی پاکستان سے ایوانِ زیریں کے ۱۶۵ اور ایوانِ بالا کے ۱۰، جب کہ مغربی پاکستان [پنجاب، سندھ، سرحد، بلوچستان، بہاول پور، خیر پور] سے ایوانِ زیریں کے ۱۳۵، اور ایوانِ بالا کے ۴۰ ارکان تجویز کیے گئے۔ یوں دونوں زون ۱۷۵، ۱۷۵/ارکانِ پارلیمنٹ پر مشتمل کرنے کی تجویز پیش کی گئی تھی۔ (ادارہ)

دراصل آج 'آئینی برابری' کے خلاف یہ ساری باتیں موقع گزر جانے کے بعد آنے والے خیال (after thought) کی حیثیت رکھتی ہیں۔

یہ بھی درست ہے کہ مشرقی پاکستان میں سیاسی احساس محرومی کو ایوبی مارشل لا اور فوجی طرزِ حکومت [اکتوبر ۱۹۵۸ء- مارچ ۱۹۶۹ء] نے اُبھارا اور اسے باقاعدہ ایک تحریک کی شکل دینے کا سامان فراہم کیا۔ پارلیمانی جمہوریت میں بنگالیوں کو اقتدار ملنے کی توقع تھی۔ وہ جانتے تھے کہ مغربی پاکستان کے کسی بھی چھوٹے صوبے کو ساتھ ملا کر، 'دستوری برابری' کے باوجود وہ اکثریت حاصل کر کے اقتدار حاصل کرسکیں گے۔ لیکن ایوبی مارشل لا نے ان کی یہ شمعِ اُمید بھی بجھادی تھی۔ پھر ایوبی مارشل لا کی آمرانہ سوچ اور اظہار پر شدید پابندیوں اور سیاسی مخالفوں پر عرصۂ حیات تنگ کرنے کی کارروائیوں نے اس احساس میں شدت پیدا کی۔

پاکستان سے بنگلہ دیش نامی کتاب میں سابق بنگالی سفیر اور کرنل شریف الحق دالم نے بالکل درست لکھا ہے کہ: ''شیخ مجیب الرحمٰن نے ۱۹۶۹ء میں علیحدگی کا فیصلہ کرلیا تھا''۔ کرنل شریف الحق بنگلہ دیش کی علیحدگی کی تحریک کے 'ہیرو' سمجھے جاتے ہیں۔ وہ بنگلہ دیش کے سابق سفیر اور اگست ۱۹۷۵ء میں مجیب الرحمٰن کے خلاف بغاوت کرنے والوں میں شامل تھے۔ چنانچہ ان کا لکھا ہوا مستند ہے۔ مجیب الرحمٰن جب جنوری ۱۹۷۲ء میں پاکستان سے رہائی پا کر لندن پہنچے تو انھوں نے بی بی سی کے انٹرویو میں ببانگِ دہل کہا کہ: ''میں عرصے سے بنگلہ دیش کے قیام کے لیے کام کر رہا تھا''۔

۱۶ نومبر ۲۰۰۹ء کو بنگلہ دیش کی وزیراعظم اور شیخ مجیب الرحمٰن کی بیٹی حسینہ واجد نے انکشاف کیا کہ: ''میں ۱۹۶۹ء میں لندن میں اپنے والد کے ساتھ تھی، جہاں شیخ مجیب الرحمٰن نے ہندستانی ایجنسی 'را' کے افسروں سے ملاقاتیں کیں اور بنگلہ دیش کے قیام کی حکمت عملی طے کی''۔ حسینہ واجد کا بیان موقعے کے گواہ کا بیان ہے۔ اس پر مزید تبصرے کی ضرورت نہیں، بلکہ اب تو ہندستانی وزیراعظم نریندرا مودی بھی 'قیام بنگلہ دیش کو ہندستان کا کارنامہ' قرار دے چکے ہیں، اور بلوچستان کی 'آزادی' کا عندیہ دے رہے ہیں۔

اس اُلجھی ہوئی کہانی کو سمجھنے کے لیے اس پہلو پر بھی غور کرنا ضروری ہے کہ جب ۱۹۵۶ء

کے آئین میں بنگالی سیاسی قیادت نے 'آئینی برابری' کا اصول مان لیا تھا تو پھر جنرل آغا یحییٰ خان نے اقتدار پر قبضہ [۲۵ مارچ ۱۹۶۹ء] کرنے کے بعد اس اصول کو کیوں ختم کیا اور کس اتھارٹی کے تحت مغربی پاکستان کی وحدت، یعنی ون یونٹ ختم کرنے اور 'ون مین ون ووٹ' کا اصول نافذ کرنے کا اعلان کیا؟ یہ بنیادی فیصلے تو نئی دستور ساز اسمبلی نے کرنے تھے۔ دراصل جنرل یحییٰ خان صدارت پکّی کرنے کے لیے مجیب الرحمٰن سے ساز باز کرنے میں مصروف تھے اور یہ دو بنیادی فیصلے اسی ہوسِ اقتدار کے تحت کیے گئے تھے، تاکہ مجیب کے اقتدار کی راہ ہموار کی جائے۔

یہ بات بھی درست ہے کہ دسمبر ۱۹۷۰ء میں انتخابات کروانے کے بعد اقتدار منتقل نہ کرنا پاکستان کو توڑنے کے مترادف تھا۔ سیاسی بصیرت اور ملکی اتحاد کا تقاضا تھا کہ اقتدار اکثریتی پارٹی کے حوالے کیا جاتا۔ اسمبلی کا اجلاس ملتوی کرنے کے نتیجے کے طور پر یکم مارچ ۱۹۷۱ء کو مشرقی پاکستان میں بغاوت ہوئی، جسے پہلے تو پوری طرح پنپنے اور اپنی گرفت مضبوط کرنے کے لیے ۲۵ روز دیے گئے اور پھر کچلنے کے لیے ۲۵ مارچ کو آرمی ایکشن کیا گیا۔ سیاسی مسائل ہمیشہ سیاسی بصیرت سے ہی حل ہوتے ہیں۔ چنانچہ اُس آرمی ایکشن نے بھی پاکستان کو بہت کمزور کر دیا تھا۔ سیاسی بصیرت کا تقاضا تھا کہ صورتِ حال کو اتنا نہ بگڑنے دیا جاتا کہ آرمی ایکشن کی نوبت آتی۔

۱۶ دسمبر ۱۹۷۱ء کے سانحے کا تجزیہ کرتے ہوئے ہمارے دانش وراور میڈیا پر بیٹھے حضرات ایک بنیادی پہلو اور اہم ترین محرک کو پسِ پشت ڈال دیتے ہیں، اور وہ بنیادی حقیقت ہے: ''بھارت کی ہمسائیگی اور بھارت کے ساتھ دوطرفہ بارڈر کا مشترک ہونا''۔ فرض کیجیے کہ مشرقی پاکستان بھارت کا ہمسایہ نہ ہوتا، تو کیا بنگالی بھائیوں کو کہیں سے اتنی مالی، سیاسی اور عسکری مدد ملتی؟ اگر وہ بڑی تعداد میں ہجرت بھی کر جاتے تو کیا دوسرا ہمسایہ ملک انھیں وہاں جلاوطن حکومت قائم کرنے کی اجازت دیتا؟ ان کے نوجوانوں کو مکتی باہنی بنا کر رات دن فوجی تربیت اور اسلحے سے لیس کر کے گوریلا کارروائیاں کرنے کی اجازت دیتا؟ آرمی ایکشن سے منسوب مبینہ زیادتیوں اور بہت سی افسانوی کہانیوں کو نہایت طاقت ور میڈیا کے ذریعے پوری دنیا میں پھیلاتا اور پاکستان کی کردار کشی کرتا؟ کمیونسٹ روس جیسی سوپر پاور سے بے پناہ اسلحہ لے کر اپنے ہمسایہ ملک پر چڑھ دوڑتا؟ اگر واقعی یہ مکتی باہنی کی فتح تھی تو پھر آٹھ ماہ سے محصور ۳۵ ہزار جوانوں پر مشتمل پاکستانی فوج نے

بھارت کے سامنے ہتھیار کیوں ڈالے؟ اسے مکتی باہنی کے سامنے ہتھیار ڈالنے چاہییں تھے۔

ظاہر ہے کہ یہ سب کچھ بھارت کا کیا دھرا تھا۔ بھارت نے بنگالیوں اور مکتی باہنی کی آڑ میں اپنے انتقام کی آگ ٹھنڈی کی، ورنہ آرمی ایکشن سری لنکا میں بھی ہوتے رہے، بھارت میں بھی سکھوں کا قتلِ عام ہوا، مگر کیا وہ علاقے اپنے ملکوں سے الگ ہوئے؟ بلاشبہہ غلطیاں، زیادتیاں اور بے انصافیاں بھی ہوئیں، جن کا جتنا بھی ماتم کیا جائے کم ہے۔ اس طرح کی غلطیاں اور بے انصافیاں بہت سے ممالک میں ہوتی رہی ہیں لیکن ان کے قومی استحکام پر زد نہیں پڑی۔ دراصل اس سارے سانحے کا ڈائریکٹر جنرل بھارت ہی تھا۔

یاد رکھیے، اسے آیندہ بھی موقع ملا تو باز نہیں آئے گا۔ ہم اپنے ہمسایہ ممالک بشمول بھارت سے اچھے دوستانہ روابط قائم کرنے کے حق میں ہیں۔ جنگیں مسائل کا حل نہیں ہوتیں۔ امن ہم سب کی ضرورت ہے، لیکن اس کا ہرگز یہ مطلب نہیں کہ تاریخ کو بھلا دیا جائے، کیوں کہ جو قومیں اپنی تاریخ فراموش کر دیتی ہیں ان کا جغرافیہ انھیں فراموش کر دیتا ہے۔

۱۶ دسمبر ۱۹۷۱ء بلاشبہہ ہماری تاریخ کا سیاہ ترین دن ہے کہ اُس روز ہمارے قومی وجود کے دو حصّے کر دیے گئے تھے اور پاکستان دشمنوں نے پاکستانی قومیت کے تصور پر نہایت کاری زخم لگایا تھا، جس سے ابھی تک خون رِس رہا ہے۔ اس سانحے نے جہاں ہماری قومی سوچ اور لاشعور پر گہرے اثرات مرتب کیے اور قوم کو مستقل طور پر بے یقینی کے خوف میں مبتلا کر دیا، وہاں ملک کے اندر بھی علیحدگی پسند عناصر کی حوصلہ افزائی ہوئی۔ باشعور قومیں اس طرح کے سانحات سے سبق سیکھتی ہیں، لیکن بدقسمتی سے ہماری قیادت، سیاست دانوں اور رائے عامہ کی تربیت کرنے والے اداروں نے مشرقی پاکستان کی علیحدگی کے اسباب اور نتائج اور عوامل پر اس طرح غور نہیں کیا کہ وہ اس کے ذمہ دار عوامل کی روشنی میں مستقبل کے لیے حکمت عملی وضع کرتے اور اس پر خلوصِ نیت سے عمل کرتے۔

دو قومی نظریہ اور بنگالی بھائی

تاریخ کے جھروکے سے جھانکیں تو واضح شواہد ملتے ہیں کہ جب تحریکِ پاکستان اپنے عروج پر تھی تو خیبر سے لے کر سلہٹ تک تمام مسلمان یہ نعرہ بلند کر رہے تھے: ''لے کے رہیں گے پاکستان، بن کے رہے گا پاکستان''۔ تحریکِ پاکستان اور مطالبۂ پاکستان کی نظریاتی بنیاد دو قومی نظریہ تھا،

جس پر کُل ہند مسلم لیگ کی قیادت اور قائداعظم زور دیتے رہے اور اسے عوام کے ذہنوں میں راسخ کرنے کی کوششیں کرتے رہے۔ اگرچہ یہ نظریہ سرسیّداحمد خان نے پیش کیا تھا، لیکن اس نظریے کے خاکے میں صحیح معنوں میں اسلامی اور نظریاتی رنگ علامہ محمد اقبال نے بھرا اور اس کی تعبیر کا تصور پیش کیا۔ اس نظریے کی بنیاد پر عمارت قائداعظم نے کھڑی کی، حتیٰ کہ وہ وقت بھی آیا کہ جب انڈین نیشنل کانگریس کو بھی اس حقیقت کے سامنے سرنگوں ہونا پڑا اور انگریز حکمرانوں نے بھی اسے تسلیم کر کے مطالبۂ پاکستان مان لیا۔ گویا دوقومی نظریے کی جڑیں ہماری تاریخ میں پیوست تھیں، لیکن اس کی تعبیر کے لیے اسے عملی شکل کس طرح دی جانی تھی، اس کا انحصار مسلمانوں کی قیادت، ان کی سیاسی جماعت اور عوام کے رُخ پر تھا۔

دوقومی نظریے کی نہایت پُرزور اور پُرتاثیر وکالت قائداعظم محمد علی جناح نے ۲۳ مارچ ۱۹۴۰ء کو مسلم لیگ کے اس اجلاس میں کی تھی، جس میں قراردادِ لاہور یا قراردادِ پاکستان منظور کی گئی تھی۔ یہ قرارداد شیرِ بنگال مولوی فضل الحق نے پیش کی تھی۔ قائداعظم نے دوقومی نظریے کی نہایت مدلل اور مؤثر وضاحت کی۔ بعدازاں جب شیخ مجیب الرحمٰن نے پہلے صوبائی خودمختاری اور پھر علیحدگی کی تحریک شروع کی، تو امرِواقعہ ہے کہ انھوں نے بھی اپنی سیاسی حکمت عملی کی بنیاد پر دوقومی نظریے کو کبھی رد نہیں کیا تھا۔ حقیقت یہ ہے کہ مشرقی پاکستان کی علیحدگی کا تعلق کسی طرح بھی دوقومی نظریے سے نہیں تھا۔ اس لیے مشرقی پاکستان کی علیحدگی کے بعد بھارتی وزیراعظم اندرا گاندھی کا یہ اعلان کہ: ''ہم نے دوقومی نظریہ خلیج بنگال میں ڈبو دیا ہے'' محض ایک سیاسی بڑ تھی، جس کا مقصد پاکستان کی نظریاتی سوچ اور اساس کو متزلزل کرنا تھا۔

اس پس منظر میں ہم یہاں ایک مجلس میں پیدا شدہ صورتِ حال قارئین کے سامنے پیش کرتے ہیں۔ ہوا یوں کہ ۲۰۰۶ء میں مسلم لیگ کی صدسالہ تقریبات کی مناسبت سے اسلام آباد میں ایک کانفرنس کا انعقاد کیا گیا، جس میں بنگلہ دیش سے بھی اسکالر شریک تھے، جن میں نمایاں نام پروفیسر ایم ٹی حسین، گوہر علی، اشرف چودھری اور ڈاکٹر عبدالرحیم ہیں۔ انھوں نے کانفرنس میں بالکل صحیح اور برمحل احتجاج کیا تھا۔ ہوا یہ کہ اُن دنوں مسلم لیگ ق کی جانب سے سینیٹ کے ڈپٹی چیئرمین جان محمد جمالی صاحب نے مذکورہ کانفرنس سے خطاب کرتے ہوئے کہا: ''دوقومی نظریہ ختم ہوچکا